اسلامی تحریک کے مراحل دورِ حاضر میں

نعیم صدیقی

چھٹی صدی ہجری تک دین و سیاست کے درمیان جو آویزش بپا رہی تھی' اس نے ایک فیصلہ کن انجام پر پہنچنے کے بعد دین کو زندگی سے الگ ہٹا کر جامد مذہبیت کے سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کردیا۔ ... جامد مذہبیت کے فروغ پانے کے بعد مسلمان کے ذہن سے یہ بات بالکل نکل ہی گئی کہ اسلام کی دعوت میں کوئی انقلابی پہلو بھی پایا جاتا ہے اور اس کا طریق کار ایک بڑھنے اور پھیلنے والی تحریک کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ شعور بالکل ختم ہوگیا کہ اسلام نظامِ سیاست و تمدن کو اپنے نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے' اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے وہ قیادت و اقتدار کی باگ ڈور پر بلا شرکت غیرے مکمل قبضہ چاہتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے سرپرستوں نے اسلام کو نظامِ کفر کے سایے میں ایک پرامن اور وفادار خادم کے مقام پر گرانے کی کوشش کی اور اسے ہر قسم کے ماحول میں "بے ضرر" دھرم بنا کر رکھنے کے لیے اپنی قوتیں صرف کردیں۔

اس طرح جب "تحریکیت" کے بجائے اسلام میں جامد مذہبیت کے انداز پیدا کردیے گئے تو پھر دین کی دعوت' دینی نظمِ جماعت' دینی تحریک' دینی مقاصد' دینی طریقِ کار وغیرہ کے مفہوم میں بھی جمود سرایت کرگیا اور دینداری اور جمود باہم لازم و ملزوم ہوگئے۔ جن حضرات نے ایک طویل محنت کے بعد یہ صورتِ حالات پیدا کی ہے ان کے سامنے اسلام کا ایک ایسی تحریک بن کے ابھرنا جو قوت کی باگ ڈور سنبھال کر زندگی کی ساری کارگاہ کو نئے انداز سے منظم کرنا چاہتی ہے' ایک ایسی انوکھی صورتِ حالات ہے' جس سے وہ خواہ مخواہ اُپراتے ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حرکت و عمل کا یہ سارا طوفان ایک ہنگامۂ دنیویت ہے' اس میں دین کی اصل روح کارفرما ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نشوونما پاتی ہوئی تحریک پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی آنکھوں پر

ان ہی چند خاص اصطلاحات کی رنگین عینکیں لگا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں جو جامد مذہبیت کے تنگ تصورات کی حامل ہیں۔ ان تنگ تصورات کے تنگ پیمانوں سے جب وہ جماعتِ اسلامی کی سرگرمیوں کو ماپنا چاہتے ہیں تو یہ پیمانے چھلک جاتے ہیں اور وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ ۔

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ' پیہم رواں ' ہر دم جواں ہے زندگی

... اس طرح کے محدود ذہنی تصورات کو ذہنوں میں جگہ دے کر یہ سمجھنا آدمی کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ ایک نشوونما پاتی ہوئی تحریک کس طرح چلا کرتی ہے' اسے ہر ہر قدم پر کس طرح تو بہ تو مراحل پیش آتے ہیں اور وہ انھیں کن کن طریقوں سے حل کرتی ہوئی آگے بڑھا کرتی ہے۔ ... اسلام کے تحریکی مزاج کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر اس حقیقت کا فہم کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ دین کی علمبرداری کرنے والے کسی کارواں کا راستہ کن کن وادیوں سے ہوتا ہوا اور کون کون سے موڑ مڑتا ہوا آخری نصب العین تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اب ضروری ہے کہ ...
[ہم] اسلام کی راہِ عمل اور اس کے مراحلِ کار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تحریکی فطرت کو پیش نظر رکھیں۔

جامد مذہبیت نے دعوتِ دین کی اصطلاح کو مروجہ تبلیغ کا محدود مفہوم دے کر جس سطح پر گرا دیا ہے' وہ اسلام کے تصورِ دعوت و تبلیغ سے بہت ہی پست ہے۔ بخلاف اس کے جماعتِ اسلامی "دعوت" کی اصطلاح کو اس کے جامع مفہوم کے ساتھ اپنے پیشِ نظر رکھتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف چند مابعدالطبیعی عقاید اور فقہی جزئیات پر وعظ کہنے اور انفرادی گفتگوئیں کرلینے کا پروگرام نہیں ہے' بلکہ ہماری دعوت اقامتِ دین کی دعوت ہے' ہم ایک غلط نظامِ زندگی کو اسلامی نظامِ زندگی میں بدلنے کے داعی ہیں۔ ہماری دعوت کا خطاب صرف افراد ہی سے نہیں' بلکہ معاشرے کے مجموعی وجود اور تمدن و سیاست کے ہمہ گیر اداروں سے بھی ہے۔ ... کبھی یہ دعوت ناصحانہ پیرائے میں دینی پڑتی ہے اور کسی موقع پر ناقدانہ پیرائے میں' کبھی اس کے لیے نرم سے نرم انداز ڈھونڈ کے لانا پڑتا ہے اور کبھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ گرم سے گرم پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے۔ ... پھر یہ پہلے قدم پر جو کچھ ہوتی ہے' دوسرے قدم پر اس سے زیادہ وسعت اختیار کرلیتی ہے۔ پھر تیسرے قدم پر کسی انداز میں اور زیادہ زور دار ہمہ گیری کے ساتھ نمودار ہوتی ہے --- یہاں تک کہ پورے معاشرہ پر چھا جائے۔ یہ دعوت لڑاتی بھی ہے' اور صلح بھی کراتی ہے' یہ توڑتی بھی ہے اور جوڑتی بھی ہے' اور مختلف احوال و شیئون سے گزرتی ہوئی اپنی تکمیل کو

پہنچتی ہے۔

اجتماعی انقلاب کی دعوت دینے والی کوئی بھی جماعت ہو۔ . . در حقیقت اس کا وجود ہمہ تن دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی مخالف طاقتوں پر تنقید کر رہی ہو' اور اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ برسراقتدار طاقتوں کے خلاف چارج شیٹ لے کر میدان میں آئے۔ . .

بالکل اسی طرح جماعتِ اسلامی کا ایک اصول کی علمبردار جماعت کی حیثیت سے موجود ہونا' اور مختلف سرگرمیوں میں اس اصول کا مظاہرہ کرنا' تمام تر دعوتِ دین ہے۔ اس کا لٹریچر' اس کے ہینڈ بل' اس کے پوسٹر' اس کے جلسے' اس کے ریزولیوشن' اس کے بیانات' اس کی تنقیدیں' اس کے احتجاج' اس کے مظاہرات' اس کی پالیسی' اس کی مجلسِ شوریٰ کے فیصلے' اس کے ہفتہ وار' ماہانہ' سہ ماہی اور سالانہ اجتماعات' اس کی سوشل خدمات' اس کے کارکنوں کے ادبی حلقے' وغیرہ از سرتاپا اپنی مجموعی حیثیت سے اقامتِ دین کی دعوت ہیں۔ ایک اجتماعی انقلاب کی علمبردار جماعت کی سرگرمیوں کا مجموعہ دعوت ہوتا ہے' نہ یہ کہ دعوت اس کی سرگرمیوں کا ایک جز ہو۔

جن اصحاب پر دعوت کا یہ تصور اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ واضح نہیں ہے ان کو جماعتِ اسلامی کی بہت سی سرگرمیاں دعوت کے ماوراء بلکہ دعوت سے متضاد معلوم ہوتی ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوتِ دین کو پس پشت ڈال کر یا اسے ایک گونہ کمزور کر کے کچھ دوسرے سیاسی کام کیے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے حضرات جماعتِ اسلامی کی دعوت کے کسی نئے مرحلے میں داخل ہونے پر بہت اُپراتے ہیں کہ یہ کیا ہونے لگا۔ چنانچہ جب جماعت "مطالبۂ نظامِ اسلامی" کی ابتدائی تحریک لے کے آگے چلی تو بھی ان کو کھٹک ہوئی' پھر جب انقلابِ قیادت کی صدا بلند کی گئی تو اس وقت بھی ان کو الجھن ہوئی' پھر جب شرکتِ انتخاب کا فیصلہ کیا گیا تو بھی ان کو شکایت ہوئی کہ جماعت دین سے سیاست کی طرف لڑھک گئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اب جب "اجتماعی مظاہرے" کا نیا مرحلہ سامنے آیا تو اس پر ان حضرات کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کجا دین اور کجا احتجاجی مظاہرے! حالانکہ یہ سب کچھ عین جائز اور حق ہے اور یہ سب کچھ . . . نہیں۔

. . . تک درست ہو کر اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ذہنوں میں

خیر خواہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں رائے قائم

. . . ہے کہ جو دین کی دعوت

دے وہ بس دعوت ہی دے' کچھ اور نہ کرے۔ ایک داعیٔ جماعت کے لیے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اقتدار پر تنقید کرے یا اس سے کسی اجتماعی حق کا مطالبہ کرے' یا اس کے مظالم کے خلاف احتجاج کرے۔ اس نظریے کے لیے خود دین میں کوئی دلیل نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ بھی ایک نتیجہ ہے جامد مذہبیت سے متاثر چلے آنے کا۔ (معروف و منکر' ص ۱۳۶ - ۱۴۱)

...

پس دعوت کے غلط تصور اور تبلیغ کے غلط ذوق کی عینک سے اگر جائزہ لیا جائے تو پھر نتیجہ یہی ہوگا کہ وعظ و تلقین کے علاوہ جو کچھ بھی ایک تحریک سے صادر ہو وہ اس کی داعیانہ حیثیت کے منافی قرار پائے۔

درحقیقت یہ بات پلے باندھ لینے کی ہے کہ دعوتِ دین کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نفاذ کو برپا کرنے کے لیے جتنے لوازم درکار ہوں' ان کو فراہم کیا جائے اور جتنی رکاوٹیں حائل ہوں ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے' ان دونوں مقاصد کے لیے جائز حدود میں جو جو کچھ بھی اقدام کیے جائیں گے وہ سب دعوت دین کی تعریف میں داخل ہوں گے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اقدام دعوت کو پس پشت ڈالنے والا ہے۔

یہ ہے صحیح تصور دعوت' اور اس تصور دعوت کے ساتھ کام کرنے والی جماعتوں اور تحریکوں کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔(ایضاً ص ۱۴۳ - ۱۴۴)

...

جہاں تک تنقید --- اور بالخصوص وقت کی قیادت پر تنقید کا تعلق ہے' یہ ہمیشہ دعوتِ اقامتِ دین کا ایک جز رہی ہے۔...اس کا واضح اور جامع نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں ملے گا کہ آپؐ کی زبان سے جو الہامی خطبے نشر ہوئے تھے ان میں قریشِ مکہ کی معاشرتی لیڈر شپ' متولیانِ کعبہ کی مذہبی قیادت' شعرا و خطبائے قریش کی فکری و ادبی پیشوائی' سود خورانِ مکہ کی معاشی سربراہ کاری' کاہنوں اور نجومیوں کے عالمِ تصوف کی عنان برداری اور اہلِ کتاب کی فقہی امامت پر انتہائی کڑی تنقیدیں موجود ہیں' بلکہ قرآن کی بعض سورتیں ان مقتدر عناصر کے خلاف کھلے کھلے چارج شیٹ لے کر نمودار ہوئی ہیں۔ اسی تنقید نے مخالفینِ تحریکِ اسلامی کے اخلاقی موقف کو کھوکھلا کیا' تب کہیں جاکر تبدیلی کے راستے ہموار ہوئے۔

علاوہ بریں آپ اگر اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صلحائے امت نے خلفاء و سلاطین پر بہت ہی بے لاگ تنقیدیں کی ہیں۔... وہ کبھی اس پر راضی نہیں ہوئے کہ محض

توحید و رسالت کے عقائد کی تلقین کر دینے پر اکتفا کرلیں اور پھر یہ سمجھ بیٹھیں کہ دعوتِ دین کا حق ادا ہوگیا۔ دور نہ جایئے یہیں اپنے ملک کے اندر شاہ ولی اللہ دہلوی کے علمی کارنامۂ دعوت کا جائزہ لیجئے' اس میں آپ کو حکمرانوں اور عوام کے تمام طبقات کے متعلق انتہائی تلخ تنقیدیں ملیں گی۔۔۔

عین اسی طرح خود مطالبہ بھی تحریک اسلامی کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک طرف فرعون کے دربار میں خالص توحید کی دعوت لے کے جاتے ہیں' لیکن دوسری طرف وہی حضرت موسیٰؑ ہیں کہ **ارسل معی بنی اسرائیل** کا مطالبہ لیے ہوئے مصروف تقاضا نظر آتے ہیں' اور اس مطالبے کو منوا کے چھوڑتے ہیں۔ یہاں کوئی شخص گمان بھی کرسکتا ہے کہ خدا کے نبی نے دعوتِ دین کو پس پشت ڈال کر ایک سیاسی مطالبے کو اپنا مقصود بنا لیا تھا؟ نہیں یہ مطالبہ خود دعوتِ دین ہی کے تضمنات میں شامل تھا۔ بالکل اسی طرح دعوت کو لے کر چلتے ہوئے احتجاج اور مظاہرے کی منازل بھی آسکتی ہیں۔

...

کچھ حضرات کو خاص طور پر "احتجاج" تحریکِ اقامتِ دین کے مزاج سے ناسازگار محسوس ہوتا ہے' بدیں وجہ وہ اس بات کو لازم سمجھتے ہیں کہ ظلم کو بہرحال چپ چاپ سہنا چاہیے اور اس کے خلاف رائے عام کو تیار کرنے یا اقتدار کو اس سے باز رکھنے کے لیے کسی طرح کی جنبش نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں بھی دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اوّل تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی نظام کے سوا ہر نظامِ زندگی ایک مجسم و منظم ظلم ہوتا ہے اور اس ظلم کے خلاف تحریکِ اسلامی کا عین وجود ہی یکسر احتجاج ہوتا ہے۔ دوسری حقیقت یہ بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ظلم کرنے والے کو ظلم کرنے کے لیے کھلی چھٹی دیے رکھنا دین کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ ۔ ۔ ظالم کو ظلم کی اجازت دے دینا اور کسی قسم کے احتجاج کی طاقت رکھتے ہوئے آواز نہ اٹھانا ظلم کے فروغ میں مدد دینے کے برابر ہے۔ خود قرآن نے بدیں الفاظ ہر انسان کو حقِ احتجاج دیا ہے کہ:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء ۴: ۱۴۸)

اللہ کسی کی زبان سے برائی کی پکار کو پسند نہیں کرتا' بجز اس کے جو مظلوم ہو۔

۔ ۔ ۔ فی نفسہٖ احتجاج بالقول کا حق خدا کے انبیا نے بھی استعمال کیا ہے' چاہے اس کا پیرایہ کچھ ہی رہا ہو۔ مثلاً' حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے جب آزادی کے بند دروازے کھولے جانے کا فیصلہ ہوتا

ہے تو وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو ان پر روا رکھا گیا تھا' چنانچہ وہ پورے معاملے کی تحقیقات کامطالبہ کرتے ہیں اور عزیزِ مصر کے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں کہ **فما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن** ۔ چنانچہ آپؑ کی بے گناہی نکھر کے سامنے آجاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے احسان جتانے پر یہ احتجاجی فقرہ ارشاد فرماتے ہیں :

تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ (الشعراء ۲۶ : ۲۲)

تیری کرم فرمائی جس کا مجھ پر تو احسان دھرتا ہے' یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

...

پس احتجاج کو تحریکِ اسلامی سے فی نفسہٖ کوئی منافات نہیں ہے۔ ایک اسلامی تحریک کا احتجاج خود دعوت بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے حکومت اور رائے عام دونوں کے سامنے حق واضح ہوتا ہے اور باطل کی تردید ہوتی ہے !

سوال صرف احتجاج تک محدود نہیں ہے' بلکہ دین کے بہت سے رمزشناسوں کو اصل اختلاف احتجاجی مظاہروں سے ہے۔ مظاہرہ ان حضرات کے لیے ایک غیر دینی سی کارروائی ہے' یا دنیوی سیاست کا ایک طریقِ کار ہے۔ یہ احساس بھی درحقیقت اسی بنیادی تصورِ دین و سیاست کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ قابلِ غور یہ ہے کہ مظاہرے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

...

اگر مظاہرات کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو اس کی ماہیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک منظم طاقت نظامِ تمدن و سیاست کے خداوندوں اور ملک کے عوام کو اپنے احساسات سے آگاہ کرتی ہے۔ ... مظاہرہ خود یکسر ایک دعوت اور ایک تبلیغ ہی ہوتا ہے وہ دعوت و تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مظاہرہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی ایک عملی اور اجتماعی صورت کا نام ہے۔ وہ منکر کو منکر اور معروف کو معروف کہنے کا ایک وسیع الاثر پیرایہ ہے۔ مظاہرہ صرف حکمران طاقت ہی کو خطاب نہیں کرتا' بلکہ وہ رائے عام کی تربیت کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

...

پس مظاہرہ اگر جائز حدود میں رہے تو اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے دعوت کا ایک وسیع الاثر ذریعہ ہوتا ہے --- اور فی نفسہٖ اس میں دینداری کی کوئی نفی نہیں پائی جاتی' اِلّا یہ کہ اس کے لیے پیرایہ اور طریقِ کار غلط اختیار کیا جائے۔

ایک خدشہ یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے سیاسی طور طریقوں کو اختیار کر لینے سے تعمیرِ سیرت و تقویٰ کا پروگرام کمزور ہو جائے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اب تک جو سرمایۂ اخلاق و کردار جمع کیا جا چکا ہے وہ بھی نقصان کا شکار ہو جائے۔ پس اگر ان سرگرمیوں کو اختیار کرنا ہی تھا تو ابھی کافی مدت تک سیاسی مصروفیات سے بچ کر داخلی تعمیر کا کام مکمل کر لینا چاہیے تھا۔

اس خدشہ کو سب سے پہلے خود جماعتِ اسلامی اور اس کے قائم کرنے والوں ہی نے پوری اہمیت کے ساتھ محسوس کیا تھا' اور اسی کے پیشِ نظر جماعت نے سات سال تک جلسوں اور مظاہروں سے اپنا دامن بچا کر پہلے وہ نئی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی جو ان وظائف سیاسی کو پرانی روایات سے پاک کر کے نئے انداز میں سرانجام دینے کے قابل ہو۔

...

جماعت نے ایک مدت تک ان جذباتی مظاہر کے فی نفسہٖ جائز ہونے کے باوجود ان سے اپنے کارکنوں کو [اس لیے] پرہیز کرایا ہے' تاکہ کہیں نمائش پسندی اور کھوکھلی ہنگامہ آرائی کی پرانی عادات میں پھر جان نہ پڑ جائے' لیکن جب اس پہلو سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ آہستہ بتدریج سیاسی حرکت کے لیے مختلف ذرائع و وسائل کو بہ اندازِ نو استعمال کیا جانے لگا۔

علاوہ بریں سیاست کے خارجی مظاہر ایک عرصہ دراز سے اسلام کی حدود سے آزاد چلے آ رہے تھے۔... جماعت نے اس بے اسلام سیاسی ہنگامہ آرائی کے ناپاک مظاہر کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نفرت ماضی کے ردِّعمل کے طور پر بعض اصحاب میں حدِ ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی ہے اور وہ مظاہرِ سیاست کو اسلامی حدود کی پابندی میں محدود ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح مکروہ اور مضر سمجھتے ہیں جس طرح وہ اس سے پہلے تھے۔

ہم نے عندالضرورت ایک حکیمانہ تدریج کے ساتھ ان تمام ذرائع و وسائل سے کام لینا شروع کر دیا ہے جن کے بغیر کوئی تحریک عوامی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی' لیکن ان سب کو پرانی ناپاک روایات سے پاک کر کے اسلامی اصولوں کے خراد پر گھما کر از سرنو ان کی نوک پلک بنائی ہے اور مظاہرِ سیاسی کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔ ٹھوس علمی لٹریچر کے ساتھ ہم اب پوسٹروں اور ہینڈ بلوں سے بھی کام لیتے ہیں' اپنے مخصوص اجتماعات کے ساتھ ساتھ ہم اب جلسہ ہائے عام بھی کرتے ہیں' اصولِ دین کی دعوت کے ساتھ ہم حکومت کی اصلاح کے لیے مطالبہ اور ریزولیوشن بھی سامنے لاتے ہیں' اور زبان و قلم سے اظہارِ جذبات کے پہلو بہ پہلو مظاہرات سے بھی کام لیتے ہیں --- اور آگے چل کر ہمیں دوسرے مختلف جائز طریقے بھی ذرائع و وسائل کی حیثیت سے

اختیار کرنے ہوں گے۔

لیکن ہم نے سیاست کے ذرائع و وسائل کو اسلامی حدود کا پابند بنا کر اتنا بدل دیا ہے کہ ہمارے پوسٹر' ہمارے جلسے' ہمارے بیانات' ہمارے ریزولیوشن' ہمارے مطالبے اور ہمارے مظاہرے خود تعمیرِ فکر و سیرت کے نہایت مؤثر ذرائع بن گئے ہیں' وہ سیاست جو خالص دیوی خطوط پر چلتی رہی ہے۔ اس کے مظاہر یقیناً سیرت و اخلاق کے لیے تباہ کن تھے' لیکن اب جبکہ سیاست کو دین کی شاہراہ پر ڈال دیا گیا ہے' اب یہ مظاہر خود تعمیرِ سیرت و اخلاق کے بہترین ذرائع ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری تمام سیاسی سرگرمیاں جماعت کے کارکنوں کے لیے بھی اور عوام الناس کے لیے بھی سنجیدگی' وقار' پابندیٔ وقت' احترامِ نظم اور اہتمامِ اخلاق کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایک قابلِ قدر سامان بنتی جا رہی ہیں۔ اللہ کی اس عنایت پر ہم اس کے حد درجہ شکر گزار ہیں۔

وہ دنیا پرستانہ سیاست جس سے کنارہ کش ہوئے بغیر سیرت و تقویٰ کی تعمیر ممکن نہیں' اس کے ناپاک مظاہرے سے جیسی نفرت ہمیں کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ لیکن سیاست کے اسلامی حدود میں پابند ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ اس کے معتدل اور متوازن مظاہر کو تقویٰ کے منافی اور سیرت کے لیے مہلک سمجھتے ہوں' ان کے دل و دماغ میں یقیناً دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ اب تک پناہ گزین ہے۔ حالانکہ وہ سیاست جس کا محور نظام اسلامی کے قیام کا نصب العین ہو اور جس کے طریق کار کا ہر پہلو اسلامی حدود اخلاق کا پابند ہو' وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ کی عبادت ہے --- اور تمام نفل عبادات سے افضل عبادت ہے۔ یہ افضل ترین عبادت صرف ایسے لوگوں کے تقویٰ کے لیے تباہ کن ہوتی ہے جو سیاست کی ذمہ داریوں کو دین سے الگ سمجھتے ہیں' لیکن جن لوگوں کے نزدیک سیاست کی ساری خدمات خود دین ہیں' وہ تو نظامِ اسلامی کے قیام کی جدّوجہد میں جو قدم بھی اٹھاتے ہیں وہی ان کے لیے تعمیرِ تقویٰ کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت کے اکثر کارکنوں کا حال یہی ہے کہ وہ جب تانگے پر بیٹھے کوئی اعلان کر رہے ہوتے ہیں' دیواروں پر کوئی پوسٹر چسپاں کر رہے ہوتے ہیں' کسی اجتماع میں شرکت کے لیے مصروفِ سفر ہوتے ہیں' اور اسی طرح جب وہ کسی مظاہرے میں کتبات لیے چوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ان ساری ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آقا کی اطاعت و عبادت کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت صرف ان قلوب کے لیے حرام کردی جاتی ہے جو اسلامی سیاست کو بھی دین سے الگ کوئی چیز شمار کرتے ہیں۔

پھر یہ امر بجائے خود قابلِ غور ہے کہ زندگی کی جنگاہ سے الگ بیٹھ کر تعمیرِ سیرت کرنے کے

لیے میدانِ کار ہے کہاں ؟ جسے پیراک بننا ہو' اسے بہرحال پانی کی موجوں کے اندر ہی پیرنا سیکھنا ہوگا' پانی سے باہر پیرنے کی کوئی تربیت گاہ اس آسمان کے نیچے کہیں موجود نہیں ہے۔ اخلاق و تقویٰ پیدا کرنے کے لیے روحانی کسرت کا کوئی مقررہ کورس نہیں ہے کہ ہنگامہ ہائے حیات سے الگ رہ کر پہلے اسے پورا کرلیا جائے اور پھر سندِ فراغت ملنے کے بعد اپنے آپ کو مختلف ذمہ داریوں میں مصروف کیا جائے۔ اخلاق و تقویٰ تو زندگی میں کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے' اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جس حد تک عملی سرگرمیوں میں حصہ لیا جارہا ہو۔ خلوت میں رہیے تو خلوت ہی کا تقویٰ پیدا ہو گا' جلوت کا تقویٰ خلوت میں نہیں آسکتا' اس کے لیے تو جلوت ہی میں آنا پڑے گا۔ کاروبار کا تقویٰ صرف کاروبار کرنے کے دوران میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ مسجد میں نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ میدانِ جنگ کا تقویٰ تیغ و تفنگ کے ہنگامے میں کود پڑنے والوں کو ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ سبکسارانِ ساحل کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ بالکل اسی طرح سیاسیات کا تقویٰ --- جو عام انفرادی سرگرمیوں کے تقویٰ سے بہت ہی بلند مرتبہ ہے --- سیاسیات سے دامن بچا کر پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اسے جب بھی آپ پیدا کرنا چاہیں گے تو آپ کو لازماً میدانِ سیاست میں قدم رکھنا ہوگا۔ رضائے الٰہی کو اپنا مقصود بنا کر آپ حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے جس سرگرمی میں بھی حصہ لیں گے وہ عین عبادت بن جائے گی اور آپ کے اندر اخلاق و تقویٰ کی تعمیر کا وسیلہ ثابت ہوگی۔

...

تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی اہم موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لیے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر یہ دریا الحاد کے رخ بہ جانے کے بعد جب کنارے کاٹتا ہوا اپنی رودگاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑنا دنیا کا ایک محال کام ہوگا۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول' اپنی حریف طاقتوں' اپنے دور کی تاریخ' اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن و سیاست کی ساری بازی شاطرِ الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لیے آخری ہلّہ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقویٰ کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کیے بیٹھے

رہیں۔ جماعتِ اسلامی نے جس روز مطالبہ نظام اسلامی کی تحریک شروع کر کے عوامی دور میں قدم رکھا ہے' حالات گواہ ہیں کہ یہ کام اس روز سے موخر کرنا مہلک ہوتا۔ . .

پس اب جبکہ ایک قدم اٹھ چکا ہے' اس کے واپس لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا' بلکہ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ اب اس کا رکنا یا پیچھے ہٹنا --- چاہے وہ تعمیرِ سیرت ہی کے لیے کیوں نہ ہو --- ایک معرکۂ کشمکش سے فرار کی حیثیت رکھتا ہے' اور فرار ایک انقلابی تحریک کے لیے ہمیشہ موت ثابت ہوتا ہے۔ اس فرار کے بعد ایک جماعت محض مذہبی فرقہ یا سیاسی جتھا بن کے رہ جاتی ہے' وہ زمانے کی امامت نہیں کر سکتی۔ . . .

اب یہ ممکن نہیں ہے کہ عوامی دور میں قدم رکھنے کے بعد ہم لوگ ان ذرائع و وسائل سے کام نہ لیں جو سیاست کے عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے جب ۴۸ء میں کراچی کی تقریر کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ آپ مطالبے کو منوانے کے لیے کن طریقوں سے کام لیں گے تو موصوف نے صفائی سے یہ جواب دیا تھا کہ ہمیں اس کے لیے وہ سارے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو آپ نے مطالبۂ پاکستان کے لیے اختیار کیے تھے۔ (ان کے خلافِ اسلام پہلوؤں کا استثنیٰ بہرحال اپنی جگہ پر مسلّم ہے)

اوپر کی گزارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ اسلام کے ایک تحریک کی صورت میں ارتقاء کرتے ہوئے طبعی طور پر جو مراحل اسے پیش آ رہے ہیں اور آنے والے ہیں ان کو ہمارے معترضین اور ہمارے خیر خواہ دونوں جامد مذہبیت اور دین و سیاست کی تفریق کی عینکوں سے نہ دیکھیں' اور قدم قدم پر اُپرانا چھوڑ دیں۔

دماغوں کو بلند فکر بنایئے' نگاہوں کو دور رسی کا درس دیجیے' سینوں کو فراخ رکھیے اور حوصلوں کو عالی ظرفی کی صفت سے آراستہ کیجیے' یہاں تک کہ آپ پیش آمدہ مراحل کے تقاضوں ہی کو نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بتدریج پیش آنے والے احوال و مقامات کی ذمہ داریوں کو قبل از وقت سمجھ سکیں۔ آپ کو اپنے ملکی ماحول ہی کو نہیں' جہانی ماحول کو تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔ آپ کو تاریخ کی سمت' ارتقاء اور وقت کے بہاؤ کی رفتار کو جاننا چاہیے۔ آپ کو اسلام کی وسعتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے' اس کے بغیر اسلام کی انقلابی تحریکی کے ہر نئے مرحلے میں داخلے کے وقت آپ کو خواہ مخواہ کی الجھن ہوگی۔

خود ہمارے لیے یہ صورتِ حالات بہت ہی مضر نتائج رکھتی ہے کہ ہم اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں' اور ہمارے معترضین سامنے سے آ کر ہمارے لیے

بقیہ بر صفحہ ۶۵